علومِ اسلامی میں مغرب کا علمی سرقہ

(پروفیسر محمد فؤاد سزگین کی تحقیقات کی روشنی میں)

ڈاکٹر محمد اسامہ

انیسویں اور بیسویں صدی عیسوی مختلف وجوہ سے عالمِ اسلام کے لیے خوش قسمت ثابت ہوئی، کیوں کہ اس دوران مسلمانوں کے ذہنوں سے فکری جمود کا نہ صرف خاتمہ ہوا، بلکہ ان میں زندگی کے آثار بھی پیدا ہونے لگے اور انہوں نے سماجی، سیاسی اور بالخصوص تعلیمی اعتبار سے غور وفکر کرنا شروع کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلامی دنیا کے افق پر کئی ایسی شخصیتیں نمودار ہوئیں جنہوں نے علم وتحقیق اور تصنیف وتالیف کے میدان میں اپنے اسلاف کی روایات کو زندہ کرنے کی کوششیں کیں۔ ان میں سید ابوالاعلیٰ مودودی (۱۹۰۳-۱۹۷۹)، ڈاکٹر محمد حمید اللہ (۱۹۰۸-۲۰۰۲)، علامہ یوسف القرضاوی (۱۹۲۶) اور پروفیسر ڈاکٹر محمد فؤاد سزگین (۱۹۲۴ء-۲۰۱۸ء) قابلِ ذکر ہیں۔ مؤخر الذکر کا شمار دورِ جدید کے نام ور محقق، مصنف، اسلامی علوم اور سائنس کے عظیم مؤرخوں میں ہوتا ہے۔ زیرِ نظر مقالے میں علوم اسلامی میں پروفیسر موصوف کی خدمات کے ساتھ اس سلسلے میں مغرب کے علمی سرقے پر ان کے افکار کا جائزہ لیا جائے گا۔

مختصر سوانح حیات

محمد فؤاد سزگین کی پیدائش ۱۹۲۴ء میں مشرقی ترکی کے شہر بیٹس (Bitlis) کے ایک علمی خانوادے میں ہوئی۔ ان کی ابتدائی تعلیم ارضروم اور دوغوبایزیز میں ہوئی، پھر انہوں نے اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے استنبول کا قصد کیا۔ یہاں ان کی ملاقات معروف جرمن مستشرق ہیلموٹ رٹر (Hellmut Ritter)[۱۸۹۲-۱۹۷۱]

سے ہوئی، جنہوں نے ان کی زندگی کو ایک نیا رخ دیا اور انہیں تحقیق وتصنیف کی راہ پر لگایا۔ پروفیسر موصوف نے دنیا کے لیے یقیناً ایک گراں قدر علمی سرمایہ چھوڑا ہے جس کی اہمیت وافادیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ ان کی زیادہ تر تصنیفات جرمن اور ترکی زبان میں ہیں، البتہ بعض کتابوں کا انگریزی، عربی، فارسی اور اردو میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ ان کی اہم کتابوں میں تاریخ التراث العربی، عیون التراث، محاضرات فی تاریخ العلوم العربیۃ والاسلامیۃ ہیں۔ آخر الذکر کتاب میں انہوں نے علم تاریخ، علم طب، علم کیمیا، علم ریاضیات، علم فلکیات اور آثارِ علویہ (Meteorology) کی تاریخ میں مسلمانوں کی خدمات کے ساتھ تاریخ التراث العربی: تالیف کے مقاصد اور طریق کار، عربوں کے علمِ فلکیات کا یورپ پر اثر، یورپ کی تحریکِ احیاء پر عربی و اسلامی علوم کے اثرات، عربی و اسلامی علوم میں اسناد کی اہمیت، کتاب الاغانی کے مآخذ، قدیم عربی شاعری: حقیقت یا افسانہ؟ اور اسلامی ثقافت میں جمود کے اسباب جیسے اہم موضوعات پر قلم اٹھایا ہے۔ دراصل یہ وہ سات (۷) خطبات ہیں جنہیں پروفیسر موصوف نے جامعۃ الامام محمد بن سعود الاسلامیۃ ریاض کی دعوت پر معہد میں دیے تھے۔ ان کو جامعہ نے ۱۹۷۹ء میں 'محاضرات فی تاریخ العلوم' کے نام سے شائع کیا۔ اس کے بعد معہد تاریخ العلوم العربیۃ والاسلامیۃ، فرینکفرٹ، جرمنی نے ۱۹۸۴ء میں دوسرا ایڈیشن چھ خطبات کے اضافے کے ساتھ 'محاضرات فی تاریخ العلوم العربیۃ والاسلامیۃ' کے نام سے شائع کیا، البتہ یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ اضافی خطبات کون سے ہیں؟ اور انہوں نے کس پروگرام میں دیے تھے؟ اس کی وجہ یہ رہی کہ راقم کو عربی نسخہ باوجود کوشش کے نہیں مل سکا۔ ڈاکٹر خورشید رضوی، سابق رفیق، ادارۂ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد نے ان خطبات کو اردو میں منتقل کیا ہے جو پہلے قسط وار سہ ماہی 'فکر ونظر' (جولائی—ستمبر ۱۹۸۶ء تا اپریل—جون ۱۹۹۳ء) میں شائع ہوئے، پھر بعد میں ادارۂ تحقیقات اسلامی، بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی، اسلام آباد کی جانب سے 'تاریخ علوم میں تہذیب اسلامی کا مقام' کے عنوان سے کتابی شکل میں ان کی اشاعت ہوئی۔ راقم الحروف کے پیش نظر یہی کتاب (دوسرا ایڈیشن، ۲۰۰۵) ہے۔

یورپ کا علمی سرقہ

ڈاکٹر فؤاد سزگین نے اس کتاب میں موضوع کا حق ادا کر دیا ہے۔ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے مسلمانوں کے سائنسی اور علمی ورثہ کو دنیا سے متعارف کرایا ہے۔انہوں نے اپنی تصانیف میں دلائل کے ساتھ ثابت کیا ہے کہ موجودہ سائنس اور ٹکنالوجی کی بنیاد دراصل مسلمانوں ہی نے رکھی ہے اور اس کی اساس ان کی تحقیقات واختراعات پر قائم ہے، اگرچہ یورپ نے اس کا انکار کیا ہے اور یہ نقطۂ نظر پیش کیا ہے کہ سائنسی علوم میں پہلے یونان اور پھر یورپ غالب رہا ہے، یعنی انہوں نے مسلمانوں بالخصوص عربوں کی خدمات کا سرے سے انکار کیا ہے اور اگر کہیں ذکر یا تسلیم کیا ہے تو سرسری طور پر۔مستشرقین کی اکثریت کا یہی نقطۂ نظر ہے۔

فؤاد سزگین نے مغرب کے پیش کردہ اس نظریہ پر تنقید کی ہے کہ مسلمانوں نے اپنی سادگی اور کم علمی کی وجہ سے اسلامی اور سائنسی علوم میں کوئی اضافہ نہیں کیا ہے، بلکہ انہوں نے صرف یونانیوں سے نقل کیا ہے اور ان کی حیثیت ایک قلی سے زیادہ نہیں ہے۔اس کا مفصل جواب دیتے ہوئے سزگین نے فرمایا ہے کہ اب یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ اہل یونان سے قبل ڈھائی ہزار برس کی علمی تاریخ موجود رہی ہے، نیز یونانیوں اور یورپ کے درمیان مسلمانوں کا دور ہے۔امت مسلمہ کی علمی سرگرمیوں کا آغاز پہلی صدی ہجری میں ہی ہو گیا تھا اور ساتویں آٹھویں صدی ہجری تک آتے آتے وہ علمی اور سائنسی دنیا میں ثریا کی بلندیوں پر محوِ پرواز تھی۔اس دوران میں اس نے دیگر قوموں، مثلاً اہل یونان، اہل بابل، اہل ایران اور اہل ہند کے علوم سے ترجمے، اخذ و استفادے، تقلید اور تنقید کے علاوہ خود اپنی تحقیقات و تصنیفات سے دنیا کو غیر معمولی فائدہ پہنچایا، جس کا اعتراف مغرب نے ایک زمانے تک نہیں کیا، یہاں تک کہ اٹھارہویں صدی میں کہیں جا کر بعض مستشرقین نے اس سلسلے میں مثبت رخ اختیار کیا ہے۔ڈاکٹر موصوف نے مغرب کی ایک علمی خیانت کی طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ لاطینیوں اور اسی قبیل کے دیگر افراد نے مسلمانوں کی بہت سی ایجادات کا سہرا مغربی

سائنس دانوں کے سر باندھ دیا، یا ان کی کتابوں اور علمی کاوشوں کو اپنے ناموں سے منسوب کیا۔ اس سلسلے میں انہوں نے متعدد مثالیں پیش کی ہیں۔ اس حوالے سے وہ ایک جگہ رقم طراز ہیں:

> ''عظیم البرٹس' (Albertus Magnus (before 1200–1280) کے بارے میں اب ہمیں یقینی طور پر یہ معلوم ہو چکا ہے کہ وہ یونانی زبان سے ناواقف تھا۔ ارسطو کی کتابوں سے اس کی واقفیت محض ابن سینا اور ابن رشد کی شروح کے واسطے سے تھی۔ یہ البرٹس یورپ کی تحریک احیاء کے زمانے میں بہت سے علوم، مثلاً حیوانیات نباتیات، حجریات، آثار علویہ اور کیمیا کا بانی سمجھا جاتا ہے اور یہ تصور کیا جاتا ہے کہ اس ضمن میں اس کا انحصار یونانی مآخذ پر رہا ہے، حالاں کہ حقیقت یہ ہے کہ اس نے یہ اور ایسے ہی دوسرے خیالات ابن سینا، ابن رشد اور جابر بن حیان کی کتابوں میں پائے جانے والے مواد سے اخذ کیے تھے۔'' (تاریخ علوم میں تہذیب اسلامی کا مقام، محمد فؤاد سزگین، مترجم: خورشید رضوی، ادارۂ تحقیقات اسلامی، بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی اسلام آباد، ۲۰۰۵ء، ص ۱۵۱)

عجیب بات یہ ہے کہ علمی سرقہ اور دوسروں کی ایجادات کو اپنی طرف منسوب کر لینے کا عمل مغرب کے قدیم اور جدید دونوں ادوار میں پایا جاتا ہے اور اس میں مستشرقین کا اہم کردار رہا ہے۔ یہ طبقہ ان متعصب یہودی اور عیسائی محققین پر مشتمل ہے جن کا بنیادی مقصد اسلام اور مسلمانوں کی عظمت نقصان پہنچانا ہے۔ ان لوگوں نے اپنی زندگی اسلام اور مسلمانوں کے خلاف پروپیگنڈا کے لیے وقف کر دی اور مشرق سے جو بھی مفید چیزیں اخذ کی گئی ہیں ان کو علمی دیانت کے برخلاف، ان کے مآخذ و مصادر کو پوشیدہ رکھ کر انہیں مغرب سے منسوب کر دیا۔ ڈاکٹر غلام جیلانی برق نے لکھا ہے:

> ''یہ ایک حقیقت ہے کہ مسلمان بارود، قطب نما، الکحل، عینک اور دیگر بیسیوں اشیاء کے موجد تھے، لیکن بقول رابرٹ بریفالٹ مؤرخین

یورپ نے عربوں کی ہر ایجاد اور انکشاف کا سہرا اس یورپی کے سر باندھ دیا ہے جس نے پہلے پہل اس کا ذکر کیا تھا۔ مثلاً قطب نما کی ایجاد ایک فرضی شخص فلویو گوجہ کی طرف منسوب کر دی۔ 'ولے ناف کے آرنلڈ' کو الکحل اور بیکن کو بارود کا موجد بنا دیا۔ صرف یہی نہیں بلکہ بعض اوقات عربوں کی تصانیف پر اپنا نام بطور مصنف جڑ دیا۔ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا میں لفظ جیبر (Geber) کے تحت ایک مترجم کا نام دیا ہوا ہے، جس نے اسلام کے مشہور ماہر کیمیا داں جابر بن حیان کے ایک لاطینی ترجمے کو اپنی تصنیف بنا لیا تھا۔ یہی حرکت سلرنو کالج کے پرنسپل قسطنطین افریقی (۱۰۶۰) نے بھی کی تھی کہ ابن الجزار کی 'زاد المسافر' کا لاطینی ترجمہ 'Viaticum' کے عنوان سے کیا اور اس پر اپنا نام بطور مصنف لکھ دیا۔'' (یورپ پر اسلام کے احسانات، غلام جیلانی برق، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ص ۲۷۔۲۸)

اہل مغرب کے اس طرزِ عمل کے برعکس مسلمانوں کا رویہ یہ رہا کہ انہوں نے بنیادی مآخذ کا ذکر اپنی تحریروں اور تصنیفوں میں پوری وضاحت اور صراحت کے ساتھ کیا ہے، نیز انہوں نے اہلِ یونان سمیت دیگر اقوام کی کسی ایجاد کو اپنی طرف منسوب نہیں کیا، اس لیے کہ انہیں نہ صرف علمی خیانت پر مواخذہ کا احساس تھا، بلکہ وہ اسے اخلاقی اقدار اور اسلامی تہذیب کے خلاف سمجھتے تھے۔ ڈاکٹر فؤاد سزگین نے اس کی ایک وجہ یہ بتائی ہے:

''مسلمانوں نے اجنبی اقوام سے علمی اکتساب کا آغاز ان لوگوں کے وسیلے سے کیا جو اسلام قبول کر چکے تھے، چنانچہ ان کے ہاں استفادے میں تعصب کا عنصر شامل نہ تھا۔ اس کے برعکس لاطینیوں نے عربوں کو اپنا حریف اور دشمن سمجھتے ہوئے ان سے استفادہ کیا، جو نفسیاتی الجھنوں کا باعث بنا۔ مسلمانوں کے ہاں وضاحت کا چلن رہا، جب کہ لاطینیوں کے ہاں سرقہ و انتحال نے رواج پایا۔'' (تاریخ علوم میں تہذیب اسلامی کا مقام، ص ۱۴)

یہاں ایک قابلِ ذکر اور دل چسپ بات یہ ہے کہ اہل مغرب نے صرف علم و

تحقیق اور ترجمہ نگاری میں ہی مسلمانوں کی تقلید نہیں کی، بلکہ انہوں نے مسلم دنیا سے یونی ورسٹی کے قیام میں بھی مدد لی اور ان کے طرز پر اپنے ہاں یونی ورسٹیاں قائم کیں، اگرچہ اس کا اعتراف کم ہی مؤرخین نے کیا ہے۔ فؤاد سزگین نے لکھا ہے:

> ''ساتویں صدی ہجری/تیرہویں صدی عیسوی کی طرف آئیں تو یورپ میں سب سے اہم علمی مظہر جو سامنے آتا ہے، وہ یونی ورسٹیوں کا قیام ہے۔ یورپ کے جو جو شہر عربی و اسلامی علوم سے اخذ و اکتساب کے مرکز تھے، انہی میں یونی ورسٹیاں قائم ہوئیں۔ مؤرخین نے بارہا ان جامعات کے قیام کی توجیہ کرنے کی کوشش کی ہے، کیوں کہ یہ جس انداز میں قائم ہوئیں، اس کی کوئی مثال یورپ میں موجود نہ تھی۔ ان کا تصور نہ یونانیوں کے ہاں معروف تھا، نہ یورپ کے قرون وسطیٰ میں موجود تھا اور اسی زمانے میں (اسلامی دنیا) کی صورت حال آج سب کے علم میں ہے۔ یہ یونی ورسٹیاں اپنے اصول و فروع، نیز منصوبوں میں صرف اور صرف اسلامی یونی ورسٹیوں کی تقلید پر قائم تھیں۔ یہ خیال محض ایک گمان نہیں، بلکہ ایک ایسا (علمی) نتیجہ ہے جس تک ایک جرمن ساتھی نے رسائی حاصل کی ہے اور تقریباً دس سال قبل وہ اپنی تحقیق شائع کر چکا ہے۔'' (ایضاً، ص ۱۵۰)

محمد فؤاد سزگین اپنے خطبات (محاضرات فی تاریخ العلوم العربیة و الاسلامیة) میں اسلامی علوم کی تاریخ کے حوالے سے مسلمانوں اور عربوں کی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے مغرب کے علمی سرقوں کا بھی جائزہ لیتے ہیں۔ اس حوالے سے ان کا طریقۂ کار یہ رہا ہے کہ انہوں نے پہلے ان موضوعات کے حوالے سے عربوں سے قبل یعنی دیگر اقوام کی علمی تاریخ پر گفتگو کی ہے، پھر مسلمانوں کے اخذ و استفادہ، تحقیق اور حذف و اضافہ کو صدیوں میں تقسیم کرتے ہوئے مفصل بحث کی ہے۔ ان کے مطابق مسلمانوں نے پہلی صدی تا تیسری صدی ہجری تک دیگر اقوام کے علوم کو اخذ کیا، پھر تیسری صدی ہجری کے وسط سے لے کر آٹھویں صدی ہجری کے بعد جمود کے آغاز تک

ان علوم میں نت نئے اضافے کیے اور تنقیدیں کیں۔ پروفیسر موصوف نے اپنی تحقیق کے ذریعے اسلامی علوم کے یورپ میں منتقل ہونے کے تین راستے (بیزنطہ، اندلس، اٹلی) مقرر کیے ہیں، جس کا آغاز تیسری صدی ہجری کے اواخر میں ہوا۔ مزید برآں انہوں نے اس بات کا خصوصی ذکر کیا ہے کہ مغرب نے کس طرح مسلمانوں کی تحقیق وتصنیف سے فائدہ اٹھایا اور انہیں اپنی طرف منسوب کرلیا۔ انھوں نے بعض جگہوں پر ان کے نام بھی پیش کیے ہیں۔ (ایضاً، ص ۱۴۹)

آئندہ سطور میں ان ہی پہلوؤں پر تفصیل سے گفتگو کی جائے گی، ان شاء اللہ۔

تاریخ علوم

محمد فؤاد سزگین نے اس بارے میں تاریخ علوم میں مسلمانوں اور عربوں کے مقام کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے اور دلائل سے ثابت کیا ہے کہ مسلمانوں نے آغاز میں تو اس میدان میں یونانیوں سے باقاعدہ اعتراف کے ساتھ اپنی علمی پیاس بجھائی، لیکن پھر وہ اس میں خود کفیل ہو گئے۔ اس کے برعکس یورپ کے احیائی تحریک کے دوران مغربی محققین اور سائنس دانوں نے عربی تصانیف وایجادات کو اپنے نام سے منسوب کرلیا تھا۔ جیسے راجر بیکن (Roger Bacon)[۱۲۱۴-۱۲۹۲] نے جو کچھ بھی نتائج اخذ کیے وہ دراصل ان عربی کتب کا نچوڑ تھے جن کا ترجمہ لاطینی زبان میں کیا گیا تھا۔ رایموندوس لولوس نے علم کیمیا پر جو کتابیں تصنیف کیں ان میں سے اکثر عربی کتب سے ماخوذ ہیں۔ ان کے علاوہ لیون ہارٹ فوکس (Leonhart Fuchs) [۱۵۰۱-۱۵۶۶] اور پاراسیلسوس (Paracelsus)[۱۴۹۳-۱۵۴۱] کے نام بھی اسی فہرست میں شامل ہیں۔

تاریخ طب

مسلمانوں نے دیگر علوم کی طرح علمِ طب کی ترویج وترقی میں بھی اہم کردار ادا کیا ہے، اگرچہ اہلِ مغرب کی اکثریت نے اس سے انکار کرتے ہوئے کہا ہے کہ انہوں

نے صرف اہل یونان کی شاگردی اختیار کی ہے، اپنی طرف سے کوئی اضافہ نہیں کیا ہے۔ فؤاد سزگین نے اس کی پرزور تردید کی ہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے جابر بن حیان، ابوبکر رازی، کمال الدین فارسی، ابوالحسن طبری، ابن سینا، ابوالقاسم الزہراوی، عبدالملک بن زہر، لسان الدین ابن الخطیب، احمد بن علی بن خاتمہ، ابن النفیس، علی بن عباس، عبداللطیف البغدادی اور عمار موصلی کی مہارتوں، خدمات اور تصنیفات کا ذکر کیا ہے۔ آخر میں طب کے میدان میں مغرب کی علمی خیانت کا مختصراً ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''بعض اہم جراحی عمل، جو بعض بڑے جراحوں سے منسوب کیے جاتے ہیں، الزہراوی کی کتاب (التصریف) میں موجود تھے۔ مثال کے طور پر ان میں سے ایک، بڑی نسوں سے خون بہنے کی روک تھام کا عمل ہے، جس میں سولہویں صدی کے فرانسیسی جراح پارے (Ambroise Pare[۱۵۱۰- ۱۵۹۰]) نے شہرت پائی۔ اسی طرح فن تولید (Obstetrics) میں وہ طریقہ جو جرمن طبیب والہر (Walcher, D. 1935) سے منسوب ہے اور 'وضع والہر' (Walcher Position) کہلاتا ہے۔ یہ بھی عرض کرتا چلوں کہ الزہراوی زخموں کی سلائی کے مختلف طریقوں سے واقف تھا اور یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ جو طریقہ ٹرنڈلن برگ (Freiedrich Terndelenburg[م ۱۹۲۴ء]) کی نسبت سے 'ٹرنڈلن برگی' کہلاتا ہے، وہ بھی ابوالقاسم الزہراوی کے ہاں معروف تھا۔ (ایضاً، ص ۵۹)

ڈاکٹر موصوف نے مسلمانوں کی ان بعض کتابوں کا بھی ذکر کیا ہے جو ایک زمانے تک یورپ میں اہل یونان کی طرف منسوب ہوتی رہیں، جیسے **حنین بن اسحق** کی **کتاب العین**، **اسحق بن عمران** کی **کتاب المالینخولیا**، **ابن الجزار** کی **کتاب الباہ** اور ابن سینا کی **کتاب الأحجار** مغرب میں جالینوس، روفوس، اسکندر طرالیسی (Alexander of Tralles, 525AD-605AD) اور ارسطو کی تصانیف کی حیثیت سے معروف رہیں۔ (ایضاً۔ ص ۶۲)

تاریخ کیمیا

پروفیسر سزگین نے اس عنوان کے تحت علم کیمیا کے آغاز وارتقا، نیز اس میں مسلمانوں کی خدمات پر بحث کی ہے، بالخصوص جابر بن حیان کے دور، اصلیت، حقائق، خدمات اور تصنیفات کا تفصیل سے ذکر کیا ہے اور اس سلسلے میں مغربی محققین کی مثبت اور منفی دونوں آراء پیش کی ہیں۔ آخر میں انہوں نے ثابت کیا ہے کہ لاطینی اور انگریزی کی کتابوں میں Geber سے مراد جابر بن حیان ہی ہے، جس سے اہل مغرب نے کثرت سے استفادہ کیا ہے۔ اس طرح کہا جاسکتا ہے کہ جدید علم کیمیا کے بنیادی اصول جابر بن حیان کی کتابوں میں موجود ہیں۔ مزید براں ڈاکٹر موصوف نے اس میدان کے دو اور ماہرین یعنی ابوبکر رازی اور ابن سینا کی خدمات بھی بیان کی ہیں۔ آخر میں انہوں نے علم کیمیا میں اہل مغرب کے سرقے کا ذکر کیا ہے کہ رازی کی مختلف کتابوں کو رایموندوس لولوس نے اپنی طرف منسوب کرلیا۔ اسی طرح ابن سینا کی کتاب الشفاء میں معدنیات کا حصہ غلط طریقے سے ارسطو کی طرف منسوب کیا جاتا رہا۔ (ایضاً، ص ۸۰)

تاریخ ریاضیات

فؤاد سزگین نے اس باب کا آغاز علم ریاضی کے حوالے سے مسلمانوں کی خدمات پر مغربی مؤرخین کی مثبت اور منفی آراء سے کیا ہے۔ اس کے بعد انہوں نے صدیوں کے تعین کے ساتھ علم ریاضی میں مسلمانوں کی دل چسپی اور اس کے اسباب کا ذکر کرتے ہوئے ان کی خدمات پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ ان کے مطابق مسلمانوں نے تیسری صدی ہجری کے وسط تک یونانیوں، سریانیوں، قبطیوں، پہلویوں، ایرانیوں او رہندیوں سے اکتساب واخذ کرتے ہوئے اس فن میں مہارت حاصل کی، پھر اس میں خود کفیل ہو گئے۔ اس سلسلے میں انہوں نے ابن الہیثم، عمر خیام، بنوموسیٰ، الماہانی، ابوجعفر الخازن، شرف الدین طوسی، غیاث الدین الکاشی، ثابت بن قرۃ، النجندی، ابوالوفاء البوزجانی، ابونصر بن عراق، نصیر الدین طوسی وغیرہ کے کارناموں اور تصنیفات سے دنیا کو

واقف کرایا ہے۔ آخر میں انھوں نے حسبِ سابق مغرب کے علمی سرقہ کو دلائل سے ثابت کیا ہے، جیسے حساب المثلثات المستویہ (Palin Trigonometry) کے ارتقاء کی جس قدر مساواتیں معروف تھیں وہ سب مسلمانوں کے علم میں تھیں، اگرچہ گزشتہ دو صدیوں کے دوران ان کو وایتے (Francois Viete, 1540-1603)، جیرارڈ (Girard, D.1626)، اور کیولیری (Bonaventura Francesco Cavalieri, 1598-1647) جیسے مغربی ریاضی دانوں کی دریافت تصور کیا گیا۔ اسی طرح اس بات پر بھی اختلاف رہا کہ ایک مستقل شعبہ کی حیثیت سے حساب المثلثات کی بنیاد رکھنے والا لیوی بین گرسون (Levi Ben Gershon, 1288-1314) تھا یا ریجیومونتانوس (Regiomontanus), 1 (Johannes Muller von Königsberg 436-1476) جب کہ حقیقت یہ ہے کہ اس شہرت کا اصل حق دار نصیر الدین طوسی تھا اور دونوں مغربی ریاضی دانوں نے اسی سے استفادہ کیا تھا۔ کسر اعشاریہ بھی عربوں میں رائج تھا، جب کہ اسے کئی صدیوں تک سائمن سٹیون (Simon Stevin) [۱۵۴۸-۱۶۲۰] کی طرف منسوب کیا جاتا رہا۔ نیز ہندسہ کے معاملات میں پیمائشی پرکار (Divider) کے مستقل استعمال کی پابندی کا اصول عربوں کا ہی وضع کردہ ہے جسے بیسویں صدی کے آغاز تک لیونارڈو داونچی کی طرف منسوب کیا جارہا تھا۔ (ایضاً، ۸۹-۹۱)

تاریخ فلکیات

فؤاد سزگین نے اس باب کے تحت علم فلکیات کے میدان میں مسلمانوں کی خدمات کا جائزہ لیا ہے۔ ان کے مطابق اس فن میں عرب اسلام سے قبل بس واجبی سا علم رکھتے تھے۔ پہلی صدی ہجری کے نصف ثانی تک فلکیات میں موجود ایرانی، یونانی، سریانی اور ہندوستانی کتابوں کی عربی زبان میں منتقلی کے بعد ان میں بیداری آئی۔ انہوں نے دلائل سے ثابت کیا ہے کہ پہلی صدی ہجری سے تیسری صدی ہجری تک مسلمانوں نے اس میدان میں دیگر قوموں سے علوم کو اخذ و جذب کیا اور اس

دوران میں وہ اس قابل ہو گئے کہ فلکیات کی بنیادی اور ضروری اصطلاحات کو سمجھ کر استعمال کر سکیں۔ چوتھی صدی ہجری سے انھوں نے اس میں اپنے نت نئے افکار ونظریات اور تجربات پیش کیے، وہ بھی ایسے جو جدید دور کے تجربات سے مطابقت رکھتے ہیں۔اس کے لیے انہوں نے مختلف شہروں میں باقاعدہ رصد گاہیں قائم کیں، جن کی سرپرستی خلیفۂ وقت اپنے دور میں کرتا تھا۔آخر میں انہوں نے بعض مشہور ماہرین فلکیات جیسے الفزاری، یعقوب بن طارق،نصیر الدین طوسی،ثابت بن قرۃ،ابوالعباس،ابوسعید السجزی،حامد بن الخضر ،جعفر بن محمد بن جریر،البیرونی،ابن الہیثم،ابوعبید الجوزجانی،عمر خیام،قطب الدین شیرازی، ابن طفیل،محمد بن یحییٰ بن الصایغ،ابوجعفر البطروجی،الزرقالی،جابر بن افلح ، اور ابن شاطر وغیرہ کی خدمات اور تصانیف کا ذکر کیا ہے۔اس میں زمین،سورج اور سیاروں کی حرکت اور ان کے مدار کی شکل،زمین کی پیمائش، اس کا طریقۂ کار،جنتری اور خط استوا کا طول وعرض وغیرہ جیسے عظیم کارنامے قابل ذکر ہیں۔

یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ پروفیسر موصوف نے اپنے ایک خطبہ میں علم فلکیات میں یورپ کے علمی سرقے کا بھی دلائل کے ساتھ جائزہ لیا ہے، جیسے اسطرلاب پر دسویں صدی عیسوی کی ایک کتاب کا مؤلف انیسویں صدی عیسوی تک گربرٹ(Gerbert) سمجھا جاتا رہا، جب کہ حقیقت میں اس نے عربوں کے افکار سے اخذ و استفادہ کیا تھا، یا وہ عربوں کی کسی کتاب کا ترجمہ ہے۔مائیکل اسکاٹ (Michael Scotus, 1175-1232) نے فلکیات پر نور الدین البطروجی کی ایک کتاب، ارسطو کی کتاب مابعد الطبیعۃ اور کتاب السماء پر ابن رشد کی شروح کا ترجمہ کیا اور البطروجی کے علاوہ ابن رشد کے افکار سے استفادہ کر کے ایک نئی کتاب مرتب کی، جسے اس نے نکولاؤس دمشقی(Nicolaus of Damascus, 64Bc-04Bc) کی جانب منسوب کر دیا، چنانچہ وہ ایک زمانے تک اسی کی کتاب سمجھی جاتی رہی۔اسی طرح مارسیلز میں ایک نے شخص 'لاطینی جنتری' تیار کی،لیکن وہ الزرقالی کی جنتری کا چربہ

تھی۔خود کوپرنیکس نے الزرقالی کی کتابوں سے بہت کچھ نقل کیا ہے اور عربوں کے افکار کو اپنی طرف منسوب کر لیا ہے۔مشہور لاطینی ماہر فلکیات آلونیس دو انسولیس (Alonis De Insulis, D.1203) نے اپنی کتاب میں جابر بن افلح اور الفرغانی کی کتابوں سے سرقہ کیا ہے۔علم فلکیات میں رابرٹس کے افکار ونظریات دراصل البتّانی اور ثابت بن قرۃ سے اخذ شدہ ہیں، نیز اس کی 'مدوجزر' پر لکھی ہوئی کتاب درحقیقت الکندی کی کتاب کا خلاصہ ہے۔ بصریات کے میدان میں حجرۂ تاریک (Camera Obecure) کو دریافت کرنے اور چاند کے مشاہدے کے سلسلے میں اس کا استعمال، مثلثات کرویہ، عصائے یعقوب (Jacob's Staff) اور کسرِ اعشاریہ کی دریافت کو لیوی بن گرسون کی طرف منسوب ہے، جب کہ وہ دراصل بالترتیب ابن الہیثم ،البوزجانی، ابونصر بن عراق، ابن سینا اور الاقلیدسی کی تحقیقات ہیں۔اسی طرح ریجیومونٹانوس کی تالیف کردہ کتاب 'بطلیموس کی عظیم کتاب کا خلاصہ' دراصل البتانی اور الزرقالی کی کتابوں کی تلخیص ہے۔(ایضاً، ص ۸۵۔۱۲۲)

مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ پروفیسر فؤاد سزگین نے اسلام اور مسلمانوں کے ماضی، حال اور مستقبل، تینوں پہلوؤں کا اپنی تحریروں میں جائزہ لیا ہے۔انہوں نے جہاں ایک طرف اسلامی علوم میں عربوں اور مسلمانوں کے علمی کارناموں کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے، وہیں دوسری طرف انہوں نے مغرب کے علمی سرقوں کو اس طرح دلائل سے ثابت کیا ہے کہ دنیا اس کا اعتراف کرنے پر مجبور ہوگئی۔حیرت اس بات پر ہوتی ہے کہ انہوں نے یہ کارنامہ تن تنہا انجام دیا ہے، جس کے لیے امت مسلمہ ہمیشہ ان کی احسان مند رہے گی۔